حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم

صحیح بخاری کی روایات کے بارے میں چند نکات کی وضاحت

حضرت مولانا دوست محمد قریشی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند گرامی حضرت مولانا محمد عمر قریشی صاحب مدظلہم جنہوں نے صحیح بخاریؒ کے دفاع میں ''عادلانہ جواب'' کے نام سے قابلِ قدر کتاب لکھی ہے، ان کا ایک خط نائب رئیس الجامعہ دار العلوم کراچی حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم کے پاس آیا تھا، جس میں صحیح بخاریؒ کے بارے میں کچھ اہم سوالات تھے۔ اس خط کا جواب قدرے تفصیل کے ساتھ لکھا گیا جو افادۂ عام کے لیے شائع کیا جارہا ہے۔............................ ادارہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معلّی القاب حضرت مدظلہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حضرت والا گذارش ہے کہ امیر المؤمنین فی الحدیث الامام الھمام حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی صحیح بخاری کے متعلق جو ''اصح الکتب بعد کتاب اللہ'' کا مبارک جملہ محدثین علماء ارشاد فرماتے ہیں تو یہ حکم بخاری شریف کی احادیث مرفوعہ کے متعلق ہے یا بخاری شریف میں موجود ان واقعات کے متعلق بھی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات حسرت آیات کے بعد پیش آئے اور حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے انہیں کسی حدیث مبارک کے ذیل میں درج فرمایا۔ مثلاً واقعہ مطالبہ فدک میں مذکورہ جملے جن پر عموماً فریق مخالف معترض رہتا ہے۔

(۲) وہ جلیل القدر حضرات محدثین جن سے حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اپنی صحیح بخاری شریف میں روایت لیتے ہیں ان کے ثقہ ہونے کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ صحیح بخاری شریف کے راوی ہیں اور

بزرگوں نے فرمایا ''کان ابو الحسن المقدسی یقول فی الرجل الذی یخرج عنه فی الصحیح هذا جاز القنطرة یعنی لا یلتفت الی ما قال فیه'' (ارشاد الساری جلد اصفحہ ۳۹) مگر گذارش ہے کہ بخاری شریف میں آجانے کے سبب ان کی ثقاہت صرف علم حدیث کے متعلق ہوگی یا دیگر علوم مثلاً تاریخ میں یہ عظمت مسلم ہوگی۔

آنجناب سے دست بستہ گذارش ہے کہ اپنے قیمتی وقت سے کچھ وقت نکال کر بندہ کو جواب سے سرفراز فرمادیں نوازش ہوگی۔

محمد عمر قریشی

(جامعہ فرقانیہ دارالمبلغین کوٹ اڈو)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

گرامی قدر مکرم جناب مولانا محمد عمر قریشی صاحب زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا گرامی نامہ جو صحیح بخاریؒ کے بارے میں ایک سوال پر مشتمل تھا، موصول ہوا، چونکہ یہ ایک اہم سوال ہے جس کے بارے میں بڑی افراط وتفریط پائی جاتی ہے، اس لیے خیال ہوا کہ اس کا جواب قدرے تفصیل سے عرض کیا جائے، اور اس کے لیے فرصت نکالنے میں وقت لگا اور جواب میں قدرے تاخیر ہوگئی۔ اس پر معذرت خواہ ہوں۔

دراصل اس مسئلے میں دو نکتے بطور خاص قابل توجہ ہیں:

(۱) پہلا نکتہ یہ ہے کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ ''جمیع ما فی الصحیح صحیح'' یعنی صحیح بخاریؒ میں جو روایت بھی ہے، وہ صحیح ہے۔ اس میں پہلی وضاحت تو یہ ضروری ہے کہ یہ جملہ صحیح بخاریؒ کی صرف مسند احادیث کے بارے میں ہے، اس میں جو تعلیقات آئی ہیں، ان کے بارے میں حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے وضاحت فرمائی ہے کہ ان میں بعض تعلیقات سنداً حسن بھی ہیں اور بعض ضعیف بھی ہیں۔ (ہدی الساری، الفصل الرابع ص ۱۷)

دوسری وضاحت یہ ضروری ہے کہ اس جملے میں ''صحیح'' سے اس کے اصطلاحی معنی مراد ہیں، یعنی

مراد یہ ہے کہ بخاریؒ کی تمام احادیث مسندہ سند کے اعتبار سے اس تعریف پر پوری اترتی ہیں کہ ''رواہ العادل التام الضبط من غیر انقطاع ولا علة ولا شذوذ'' لیکن ہر روایت جو اس تعریف پر پوری اترتی ہو، اس کے بارے میں گمانِ غالب تو بے شک یہی ہوتا ہے کہ وہ نفس الامر میں بھی صحیح یا درست ہوگی، لیکن ساتھ ہی اس میں یہ احتمال پھر بھی باقی رہتا ہے کہ راوی کے قابلِ اعتماد ہونے کے باوجود اس سے کوئی غلطی ہوگئی ہو جسے حضرات محدثین ''وہم'' سے تعبیر کرتے ہیں، چونکہ گمانِ غالب یہی ہے کہ وہ نفس الامر میں بھی صحیح ہوگی، اس لیے وہ مخالف احتمال کے باوجود حجت ہے، اس لیے کہ دنیا و دین کے سارے کاروبار گمانِ غالب کی بنیاد پر ہی چلتے ہیں، اور ہر جگہ قطعی یقین کو بنیاد نہیں بنایا جاسکتا، لیکن چونکہ دوسرا احتمال بھی موجود ہے، اس لیے اگر خارجی دلائل سے وہ احتمال بذات خود یقین یا گمانِ غالب کے درجے کو پہنچ جائے تو اس صورت میں حضرات فقہاء و محدثین اس کی بنیاد پر یہ فرمادیتے ہیں کہ حدیث کے بہ حیثیت سند ''صحیح'' کے معیار پر پورا اترنے کے باوجود اس کے فلاں حصے میں راوی سے ''وہم'' ہوگیا ہے، اور وہ حصہ نفس الامر کے اعتبار سے صحیح نہیں ہے۔

اس کی بہت سی مثالیں صحیح بخاریؒ اور صحیح مسلم میں بھی موجود ہیں، یعنی حدیث کے بحیثیت سند اصطلاحی مفہوم میں ''صحیح'' ہونے کے باوجود محدثین نے فرمایا ہے کہ اس کے کسی حصے میں راوی سے وہم ہوا ہے، اس کی چند مثالیں ذیل میں درج کرتا ہوں:

(۱) صحیح بخاری کتاب الزکوۃ ''باب فضل صدقة الصحیح الشّحیح'' کے تحت حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث منقول ہے جس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواج مطہرات کے اس سوال کے جواب میں کہ ''ہم میں سے کون آپ سے (وفات کے بعد) جلدی آکر ملیں گی'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''اطولکنّ یداً'' یعنی ''جن کے ہاتھ تم میں سب سے زیادہ لمبے ہیں'' اس پر حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا یہ ارشاد منقول ہے کہ ''فکانت سودة أطولهن یداً، فعلمنا بعدُ أنما کانت طول یدها الصدقة، وکانت أسرعنا لحوقا به، وکانت تحب الصدقة''

اس روایت کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ ''اطولھن یداً'' سے مراد حضرت سودہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ہی تھیں، اور ان کے ہاتھ لمبے ہونے کا مطلب یہ تھا کہ وہ صدقہ بہت کرتی تھیں، اور انہوں نے ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے پہلے وفات پائی۔

لیکن دوسرے واضح دلائل کی روشنی میں یہ بات طے ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات میں سب سے پہلے انتقال حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا ہوا۔ چنانچہ علامہ ابن جوزیؒ نے فرمایا: ''ھذا الحدیث غلط من بعض الرواۃ .... وکل ذلک وھم، وانما ھی زینب، فانھا کانت اطولھن یداً بالعطاء کما رواہ مسلم'' (فتح الباری ص ۲۸۶، ۲۸۷ ج ۳) اور حافظ ابن حجرؒ نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ یہ وہم ابوعوانہؒ سے ہوا ہے۔

(۲) صحیح بخاری کتاب التوحید ''باب ان رحمۃ اللہ قریب من المحسنین'' میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث جنت وجہنم کے بارے میں مروی ہے، اس میں یہ الفاظ ہیں: ''فأما الجنۃ فان اللہ لا یظلم من خلقہ احدا، وانہ ینشئ للنار من یشاء'' جس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ جہنم کو بھرنے کے لیے جو مخلوق چاہے گا، پیدا کرے گا، حالانکہ یہاں راوی سے جہنم کا ذکر کرنے میں وہم ہوا ہے۔ صحیح روایت وہ ہے جو خود امام بخاریؒ نے سورۂ قٓ کی تفسیر میں نقل فرمائی ہے کہ ''وأما الجنۃ فان اللہ عزوجل ینشئ لھا خلقاً'' (حدیث نمبر ۴۸۵۰) چنانچہ علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''وقیل : ھذا وھم من الراوی الخ'' (عمدۃ القاری، کتاب التوحید ج ۲۵ ص ۲۰۶)

(۳) صحیح بخاری کی کتاب التوحید ہی میں قاضی شریکؒ کی سند سے معراج کا جو واقعہ مروی ہے، (حدیث نمبر ۷۵۱۷) اس کے بارے میں معروف ہے کہ اس میں راوی سے بہت سے اوہام ہورہے ہیں، حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ انہوں نے بارہ معاملات میں دوسری مشہور روایات کی مخالفت کی ہے (فتح الباری: ۴۸۵/۱۳) اور حضرت شیخ الحدیث صاحب قدس سرہ نے لامع الدراری میں اس پر مزید اوہام کا اضافہ کیا ہے۔

(۴) صحیح بخاری، کتاب الشروط، باب اذا اشترط البائع ظھر الدابۃ (حدیث ۲۷۱۸) میں

حضرت جابرؓ کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اونٹ بیچنے کا واقعہ مختلف روایات سے بیان ہوا ہے، اس میں داود بن قیس سے امام بخاریؒ نے یہ الفاظ تعلیقاً نقل کئے ہیں ''اشتراہ بطریق تبوک'' یعنی یہ خریداری تبوک کے راستے میں ہوئی تھی یہ تعلیق سنداً صحیح ہے، لیکن اس میں تبوک کے ذکر کے بارے میں حافظ ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ اس واقعے کا تبوک کے بجائے غزوۂ ذات الرقاع میں پیش آنا زیادہ ظاہر ہے (فتح الباری ج۵ ص۳۲۱)۔

(۵) صحیح مسلمؒ کتاب الرضاع، ''باب جواز ھبتھا نوبتھا لضرتھا'' میں حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں حضرت عطاءؒ کا یہ قول روایت کیا ہے کہ ''ماتت بالمدینة'' یہ یقیناً وہم ہے، کیونکہ حضرت میمونہؓ کی وفات سرف میں ہوئی، اور خود صحیح مسلمؒ کی دوسری روایت میں اس کی صراحت موجود ہے۔

نیز اسی باب میں حضرت عطاءؒ کی یہ روایت بھی منقول ہے کہ ''التی لا یقسم لھا صفیة بنت حیی'' حالانکہ علامہ نوویؒ نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا ''ھذا وھم من ابن جریج الراوی عن عطاء، وانما الصواب سودة، کما فی الاحادیث'' (تکملۃ فتح الملہم ۱/۸۳)۔

ان چند مثالوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جو روایات ''صحیح'' کی اصطلاحی تعریف پر پوری اترتی ہیں، ان میں بھی یہ احتمال ہوتا ہے کہ ان کی کوئی بات نفس الامر کے اعتبار سے واقعے کے مطابق نہ ہو۔ لیکن اگر کوئی شخص اس قسم کی باتوں کی بنیاد پر یہ کہنے لگے کہ ان احتمالات کی وجہ سے پوری حدیث ہی مشکوک ہوگئی، یا جو احادیث ''صحیح'' کی اصطلاحی تعریف پر پوری اترتی ہیں وہ بھی قابلِ اعتماد نہ رہیں۔ اور ان کی بنیاد پر احکام کا استنباط بھی صحیح نہ رہا، تو یہ بات بھی بالکل غلط ہوگی، اس کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ اس قسم کے اوہام ''صحیح'' احادیث میں بہت کم ہوتے ہیں، جنہیں احادیث صحیحہ کے مجموعی ذخیرے کے مقابلے میں شاذ و نادر کہا جائے تو بیجا نہیں، اور دوسری وجہ یہ ہے کہ عموماً اس قسم کے اوہام کسی حدیث یا واقعے کی جزوی اور ضمنی تفصیلات میں واقع ہوئے ہیں جن سے روایت کے مرکزی مفہوم پر اثر نہیں پڑتا، اور ثقہ راوی کسی روایت کے مرکزی مفہوم کو تو بڑے اہتمام سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن ایسی جزوی

تفصیلات جو مرکزی مفہوم کے لحاظ سے ضمنی نوعیت کی ہوتی ہیں، ان کے ضبط میں بعض اوقات اتنا اہتمام نہیں کرتے، اسی بات کو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ علیہ نے ان الفاظ میں تعبیر فرمایا ہے کہ ''وجمهور الرواة كانوا يعتنون برؤوس المعانی لا بحواشيها'' (حجۃ اللہ البالغہ ج ۱/ص ۲۴۱۔ باب القضاء فی الاحادیث المختلفة)۔

لہٰذا وہ ضمنی انداز کی باتیں جنہیں حضرت شاہ صاحب قدس سرہ نے ''حواشی'' سے تعبیر فرمایا ہے، اگر ان میں کسی راوی سے کوئی وہم ہو جائے تو اس کی بنیاد پر اس کی پوری حدیث کو رد نہیں کیا جا سکتا، چنانچہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ علیہ ایک ایسی ہی روایت کے وہم کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ ''لا يلزم من وهم الراوی فی لفظة من الحديث ان يطرح حديثه كله'' (فتح الباری، کتاب النکاح، باب موعظة الرجل ابنته تحت حدیث ۵۱۹۱ ج ۹ ص ۲۸۶)۔

اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حضراتِ محدثین اور ناقدینِ روایات نے اس معاملے میں انتہائی حقیقت پسندی اور اعتدال و توازن سے کام لیا ہے، ایک طرف وہ اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ اور اس کے معترف ہیں کہ انسان خواہ کتنا ثقہ اور قابل اعتماد ہو، بہر حال انسان ہے، اور اس سے بشری بھول چوک ممکن ہے، یہاں تک کہ حضرت یحییٰ بن معینؒ نے جو اعلیٰ درجے کے نقاد ہیں، فرمادیا کہ: ''من لم يخطئ فی الحديث فهو كذاب'' (تاریخ یحییٰ بن معین ج ۳ ص ۵۴۹ و ج ۳/ص ۲۷۴) یعنی جو شخص یہ دعویٰ کرے کہ حدیث میں اس سے کبھی کوئی غلطی نہیں ہوئی، وہ جھوٹا ہے۔

اور دوسری طرف وہ اس حقیقت کو بھی کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتے کہ قرآن کریم نے ''مَا اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ'' کا جو حکم دیا وہ قیامت تک کے لیے واجب العمل ہے اور اللہ تعالیٰ کسی ایسی بات کا حکم نہیں دیتا جس پر عمل ممکن نہ ہو، اور اسی لیے اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کی حفاظت کے لیے وہ انتظام فرمایا ہے جس کی نظیر کسی بھی مذہب و ملت میں موجود نہیں ہے، لہٰذا ان جزوی اوہام کی وجہ سے حضرات محدثین کی ان بے نظیر کاوشوں پر پانی نہیں پھیرا جا سکتا جو انہوں نے حفاظتِ حدیث کے خدا ساز انتظام کے تحت فرمائی ہیں۔ چنانچہ نقدِ احادیث کے وسیع و عریض علم نے دودھ کا دودھ اور پانی کا

پانی کر دیا ہے۔

اسی طرح یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ صحیح بخاریؒ کو جو ''اصح الکتاب بعد کتاب الله'' کہا گیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی احادیث مسندہ بحیثیت مجموعی سند کے اعتبار سے ہر دوسری کتاب سے زیادہ صحیح (بالمعنی الاصطلاحی) ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کی ہر ہر حدیث پر یہ بات صادق آتی ہے۔ چنانچہ یہ عین ممکن ہے کہ صحیح بخاری میں ایک حدیث جس سند کے ساتھ آئی ہے، کسی دوسری کتاب میں وہی حدیث زیادہ بہتر سند کے ساتھ آئی ہو، امام ابنِ ماجہؒ کی سنن کو صحاح ستہ میں سب سے آخری درجہ دیا جاتا ہے، لیکن اس کی بعض روایتوں کی سند صحیح بخاری کی سند سے زیادہ صحیح ہے، حضرت مولانا عبدالرشید نعمانی صاحب رحمہ اللہ علیہ نے اس کی کئی مثالیں دی ہیں۔ (دیکھئے امام ابن ماجہؒ اور علم حدیث از حضرت مولانا نعمانی رحمۃ اللہ علیہ ص ۲۴۳)۔

''صحیح'' اور ''اصح'' کی مذکورہ بالا تشریح کے بعد آپ نے جو پوچھا ہے کہ ''اصح الکتب بعد کتاب الله'' کا مبارک جملہ...... بخاری شریف کی احادیث مرفوعہ کے متعلق ہے یا بخاری شریف میں موجود ان واقعات کے متعلق بھی ہے جو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات حسرت آیات کے بعد پیش آئے'' اس کا جواب یہ ہے کہ ''صحیح'' اور ''اصح'' کی مذکورہ بالا تشریح کے بعد یہ جملہ دونوں ہی سے متعلق ہے، جہاں تک مطالبۂ فدک والے حصے کا تعلق ہے، اس کی حقیقت اگلے نکتے سے واضح ہوگی۔

دوسرا نکتہ

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ صحیح بخاری کی کسی روایت کے بارے میں یہ کہنا کہ سند کے اعتبار سے وہ صحیح ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جس راوی کی طرف وہ منسوب ہے، اس راوی تک اس کی سند صحیح ہے، لیکن بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک راوی کسی واقعے یا حدیث کی روایت کے بعد اس پر اپنی طرف سے کسی تشریح یا تبصرے کا اضافہ کرتا ہے جسے محدثین کی اصطلاح میں ''مدرج'' کہا جاتا ہے۔ بعض اوقات تو اس راوی کا شاگرد واضح کر دیتا ہے کہ یہ جملہ حدیث کا حصہ نہیں، بلکہ میرے استاذ کا تبصرہ ہے لیکن بعض اوقات یہ ''مدرج'' حصہ اس کی اصل روایت سے ممتاز نظر نہیں آتا، بلکہ اسی روایت کے دوسرے طرق سے معلوم

ہوتا ہے کہ یہ راوی کا ادراج ہے، اس کی بہت سی مثالیں آپ کے علم میں یقیناً ہوں گی، فدک کے مطالبے والی حدیث امام بخاریؒ نے امام زہری رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کی ہے، اور وہ اسے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت فرماتے ہیں لیکن حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث اس جملے پر ختم ہوگئی ہے کہ ''فقال ابو بکر: ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: لا نورث ما ترکنا صدقة انما یأکل آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم فی هذا المال وانی واللہ لا اغیر شیئا من صدقة رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن حالها التی کانت علیها فی عهد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولأعملن فیها بما عمل به رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، فابی ابو بکر أن یدفع الی فاطمة شیئا''۔

جس کا حاصل یہ ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مال میں میراث جاری نہیں ہوتی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ چھوڑا ہے، وہ وقف ہے اور جس طرح اس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آل وعیال پر خرچ کیا جاتا تھا، اسی طرح میں بھی کرتا رہوں گا، اس بنا پر انہوں نے حضرت فاطمہؓ کو یہ جائیداد مالک بنا کر دینے سے انکار کردیا۔

اس کے بعد جو عبارت ہے کہ حضرت فاطمہؓ، صدیق اکبرؓ پر ناراض ہوئیں اور بات چیت نہیں کی، یہ حضرت عائشہؓ کی روایت کا حصہ نہیں ہے، بلکہ امام زہریؒ کا ادراج ہے، یہ بات اسی روایت کے دوسرے طرق سے بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ یہ ساری عبارت امام زہریؒ کی ہے، حضرت عائشہؓ کی نہیں جیسا کہ بیہقیؒ کی روایت میں اس کی تصریح موجود ہے، اور اس کے مزید دلائل بندہ نے تفصیل کے ساتھ تکملۂ فتح الملہم، کتاب الجهاد والسیر، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم: لا نورث میں بیان کئے ہیں (تکملۂ فتح الملہم ج ۳ / ص ۵۵ طبع دمشق) اور حضرت مولانا محمد نافع صاحب مدظلہم نے اپنی کتاب ''رحماء بینهم'' میں اس پر نہایت فاضلانہ بحث فرمائی ہے۔ بندہ نے بھی اس سے استفادہ اور اقتباس کیا ہے۔

اب یہ روایت امام زہریؒ کی طرف منسوب ہوئی اور امام زہریؒ کی طرف اس کی نسبت صحیح (بالمعنی الاصطلاحی) ہے، یعنی امام زہریؒ سے یہ قول صحیح سند کے ساتھ ثابت ہے۔ لیکن خود امام زہریؒ نے یہ بات کس بنیاد پر کہی، اس کا علم نہیں، چونکہ وہ خود اس واقعے کے وقت موجود نہ تھے، اس لیے انہیں، اس کا براہِ راست علم حاصل ہونا ممکن نہ تھا، بظاہر یہ انہوں نے کچھ لوگوں سے سن کر ہی کہا ہوگا، اور جن لوگوں سے سنا ان کا حال معلوم نہیں ہے، اور اس کے خلاف دوسری بہت سی مسند روایات اس پر دلالت کرتی ہیں کہ حضرت صدیق اکبر اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہما کے تعلقات خوشگوار ہو گئے تھے، ان روایات کی تفصیل حضرت مولانا محمد نافع صاحب مدظلہم نے بھی بیان فرمائی ہے اور ان کا خلاصہ بندہ نے تکملہ فتح الملہم میں بھی لکھ دیا ہے، اس طرح بخاری کی یہ روایت اس حد تک صحیح (بالمعنی الاصطلاحی) ہے کہ امام زہریؒ تک اس کی نسبت صحیح سند سے ثابت ہے، لیکن خود امام زہریؒ کو بظاہر اس معاملے میں کوئی مغالطہ ہوا ہے۔

(۲) آپ نے دوسرا سوال صحیح بخاریؒ کے راویوں کے بارے میں فرمایا ہے کہ کیا ان کی حدیث کا صحیح بخاریؒ میں آجانا ہی ان کے ثقہ ہونے کے لیے کافی ہے؟ اور ان کا ثقہ ہونا علم حدیث سے متعلق ہے یا دیگر علوم مثلاً تاریخ میں بھی اس کا اعتبار کیا جائے گا؟ آپ نے علامہ قسطلانیؒ کے حوالے سے ابوالحسن مقدسیؒ کا قول بھی نقل فرمایا ہے کہ: **هذا جاز القنطرة۔**

اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ بے شک مجموعی اعتبار سے یہ بات درست ہے کہ صحیح بخاریؒ کے رجال میں سے ہونا راوی کا ایک اعزاز ہے، اور اکثر و بیشتر یہ کہنا درست ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے جن راویوں کی احادیث اپنی صحیح میں روایت کی ہیں، وہ ثقہ ہیں، لیکن ابوالحسن مقدسی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کو ایک قاعدۂ کلیہ کے طور پر سمجھنا بھی محققین کے نزدیک درست نہیں ہے، صحیح بخاریؒ میں بہت سے راوی ایسے ہیں جن پر کلام ہوا ہے، اور ان کی بعض روایات جو صحیح بخاریؒ سے باہر کی ہیں، رد کی گئی ہیں۔ بلکہ کسی حدیث کو ''علی شرط البخاری'' قرار دینے میں بعض اوقات لوگوں کو اس بناء پر بھی مغالطہ لگا ہے کہ انہوں نے کسی ایسے راوی کی حدیث دیکھی جن سے امام بخاریؒ نے صحیح میں روایت لی ہے، پھر اسی راوی کی کوئی اور حدیث کہیں دوسری جگہ نظر آئی تو کہہ دیا کہ یہ ''علی شرط البخاری'' ہے، حالانکہ بعض

اوقات کسی ثقہ راوی کے بارے میں کلام ہوتا ہے، لیکن امام بخاریؒ اس کی صرف وہ حدیث لاتے ہیں جس کے بارے میں خارجی دلائل سے ان کو ثابت ہوجاتا ہے کہ اس راوی نے یہ حدیث صحیح روایت کی ہے، لیکن ضروری نہیں کہ اس کی ہر روایت بخاریؒ کے معیار پر پوری اترتی ہو، امام حاکمؒ نے مستدرک میں اسی قسم کی روایت کو ''علی شرط البخاری'' کہہ دیا ہے جس پر دوسروں نے تنقید کی ہے، اور انہیں متساہل قرار دینے کی ایک وجہ یہ بھی ہے، اس موضوع پر علامہ جمال الدین زیلعی رحمۃ اللہ علیہ نے جہر بسملہ کی بحث میں بڑی مفصل اور فاضلانہ بحث فرمائی ہے، انہوں نے مثال دی ہے کہ امام بخاریؒ نے خالد بن مخلد قطوانی کی متعدد احادیث نقل کی ہیں لیکن ان کی وہی احادیث لائے ہیں جو انہوں نے سلیمان بن بلال وغیرہ سے روایت کی ہیں، لیکن ان کی وہ روایات نہیں لیں جو وہ عبداللہ بن مثنی سے روایت کرتے ہیں، کیونکہ وہ روایات صحت کے اعلیٰ معیار پر نہیں اترتیں، اسی طرح عکرمہ کی حضرت ابن عباسؓ سے امام بخاریؒ نے بہت کم روایات لی ہیں جن کے بارے میں ان کو اطمینان ہوگیا کہ یہ صحیح ہیں، لیکن ان کی بہت سی روایات ترک کردیں۔ چنانچہ علامہ زیلعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

لا یلزم من کون الراوی محتجا به فی الصحیح أنه اذا وجد فی ایّ حدیث، کان ذلک الحدیث علی شرطه (نصب الرایه ج ۱/ص ۴۱۸ بحث جہر بسملہ)

لٰہذا محض یہ بات کسی راوی کی تمام روایات کے مقبول ہونے کے لیے کافی نہیں ہے کہ اس کا نام صحیح بخاریؒ یا صحیح مسلمؒ میں آگیا ہے، بلکہ اس کے لیے محدثانہ چھان پھٹک کی ضرورت ہے، البتہ یہ کہنا بڑی حد تک درست ہے کہ امام بخاریؒ نے ان کی جو حدیث لی ہے، وہ صحیح کے معیار پر پوری اترتی ہے، اور اس میں علم حدیث یا علم تاریخ کا کوئی فرق نہیں، بشرطیکہ ''صحیح'' کو اس کے اصطلاحی معنی میں سمجھا جائے، اور جو دو نکتے پہلے سوال کے جواب میں عرض کئے گئے ہیں، انہیں ملحوظ رکھا جائے۔

والسلام
محمد تقی عثمانی
یکم/ذوالحجہ ۱۴۳۳ھ

☆☆☆